جاوید غامدی: تاریخ فکر اسلامی کے زعیم: زنیم یا ختار

جناب غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ دبستان شبلی کے آخری آدمی ہیں جو مشرقی و مغربی علوم کے جامع ہیں اور ان کا فکر مشرق و مغرب کے مابین ایک آخری پل ہے جس کے ذریعے دونوں تہذیبوں میں مصالحت، مفاہمت اور مکالمے کا امکان ہے۔ ان کے خیال میں مغرب کی سائنسی ترقی فکر اسلامی کی توسیع ہے اور مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کی ہی جلوہ گری ہے۔ مغرب نے مذہب انسانیت اور بنیادی حقوق کے تصورات دے کر پوری دنیا کو انسانیت کے مشترکہ کلمے پر جمع کر دیا ہے جو انبیاء کی دعوت کا منہاج تھا اور اسلامی انقلاب کی معراج و مقصود بھی.....لہٰذا اب مغربی تہذیب تاریخ کے اس موڑ پر آ گئی ہے جہاں تاریخ کا سفر اختتام پذیر ہو گیا ہے اور وہ تیزی سے اسلام کے قریب آ رہی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسلام میں ضم ہو جائے لیکن مغرب کے قبول اسلام کی راہ میں اصل رکاوٹ علماء دین، اسلامی تحریکیں، اسلامی جماعتیں اور امت مسلمہ کا وہ تصور دین ہے جو قرآن سنت اجماع و قیاس کے ماخذات کے ذریعے ظہور کرتا ہے لیکن یہ ظہور دین اسلام کا اصل چہرہ اصل رنگ اور اصل حقیقت نہیں ہے۔ روایتی اسلام جو ائمہ اربعہ کے اجماع اور مسلک جمہور کے ذریعے امت مسلمہ کی ترجمانی اور اس امت کے عقیدے کی نگہبانی کرتا ہے فی الاصل مغرب کی اسلام سے وحشت کا واحد سبب ہے لہٰذا اصل دین کا چہرہ اگر مغرب کو دکھا دیا جائے تو مغرب اسلام کی آغوش میں آ جائے گا۔

غامدی صاحب ان خیالات کو اپنے خوبصورت اسلوب، دل نشین پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے ان کی طلاقت لسانی کے قائل ہو جاتے ہیں لیکن جب ان کی خطابت اپنا گھونگھٹ الٹ کر حقیقت، تاریخ، فلسفہ، منطق، سائنس کی دنیا میں آتی ہے تو یہ محض جہالت اور جاہلیت خالصہ رہ جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ علمی مسائل کی صحت اور عدم صحت کا تعین عوام کی ذمہ داری نہیں ہے۔ عوام کالانعام ہوتے ہیں وہ نہ علم رکھتے ہیں نہ تحقیق کا ذوق نہ ان کی علمی سطح اس قابل ہوتی ہے کہ وہ غامدی صاحب جیسے متجد دین، منکرین حدیث کے افکار کا ناقدانہ جائزہ لے سکیں۔ لہٰذا غامدی صاحب اپنی خطابت سے افکار اسلامی کا..... جو تانا بانا بنتے ہیں وہ

خوبصورت تو نظر آتا ہے لیکن یہ مکڑی کے جالے سے زیادہ کم زور ہے۔ ذیل میں ہم غامدی صاحب کے دعوؤں کا جائزہ لیں گے اور مغربی فکر و فلسفہ کی تاریخ سے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ غامدی صاحب مغرب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انھیں مغربی فلسفے و تاریخ کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ انھوں نے انسانی حقوق کے منشور Human Right Dectraction کو اسلامی قرار دے کر اہل عالم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے جب کہ مذہب انسانیت کا یہ دستور وحی الٰہی یا سنت محبوب الٰہی سے اخذ نہیں کیا گیا بلکہ فیڈرلسٹ پیپرز اور امریکی دستور سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ امریکی صدر روز ویلیٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلیٹ ہیں۔ امریکی ریاست اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد مذہب حقوق انسانی پر رکھی گئی ہے جو مغرب کے جدید فلسفے سے رہنمائی لیتا ہے یہ فلسفہ ڈیکارٹ سے شروع ہوا تھا۔ *I think therefore I am* تاریخ فلسفہ میں ڈیکارٹ پہلا فلسفی ہے جس نے اس جملے کے ذریعے وجود انسانی کے سوا ہر وجود کو ناقابل اعتبار ٹھہرا کر مابعد الطبیعیاتی سوالات کو فلسفے کی اقلیم سے خارج کرنے کا فریضہ انجام دیا جس کا حتمی نتیجہ بیسویں صدی میں سامنے آیا، جب پوسٹ ماڈرن ازم کے فلاسفہ نے پچیس سو سال تک فلسفہ میں زیر بحث آنے والے تین سوالات کو جن کا تعلق Metaphysics، Epistemology، Axiology[Values] سے تھا لایعنی قرار دے کر فلسفے کی تاریخ بدل ڈالی۔

وہ تین سوالات جو پچیس سو سال تک حقیقت کلی، حقیقت ازلی اور حقیقت ابدی کے تصور اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے نتیجے میں خیر و شر کے معیارات کے تعینات سے متعلق تھے۔ فلسفہ پس جدیدیت [Post modren Philosphy] نے ان سوالات کو لایعنی، مہمل، فضول، بے کار، بے تکے قرار دیا۔ سوالات یہ تھے:

[1] What is real [2] How do we know. [3] What is good, right, or beautiful.

ڈیکارٹ نے جس ریب، شک، تشکیک کی بنیادوں پر اپنے فلسفے کی عمارت تعمیر کی بالآخر یہ بنیادیں فلسفے کی قدیم بنیادوں کے انہدام کا سبب بن گئیں اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی تہذیب وجود پذیر ہوئی جس نے مابعد الطبیعیاتی سوالات کا انکار کیا۔ خدا کے وجود سے منحرف ہوئی۔ خیر و شر کے تمام پیمانوں کو لغو بے کار لایعنی قرار دے کر خواہش نفس کو الٰہ العالمین قرار دے دیا اور نفس انسانی کو خیر و شر کا ماخذ، حق و باطل کا پیمانہ، اندھیرے اور اجالے کا منہاج قرار دے کر الوہیت رب کے بجائے الوہیت انسانی کا مذہب ایجاد کیا۔ [Religion of human rights] جس نے بحر و بر کو فساد سے بھر دیا اور دنیا کو ایک ایسی ہولناک جنگ میں جھونک دیا جس میں تین سو سال کے اندر مغربی اقوام کے ہاتھوں ایک ارب پچھہتر کروڑ لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of the

Democracyاور ساحل کے جون، جولائی، اگست اور ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے ملاحظہ فرمایے۔ ٹائن بی کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو دنیا میں اکیس تہذیبیں رہی ہیں لیکن ان اکیس تہذیبوں میں ایک بھی ایسی تہذیب نہ رہی جس میں مابعد الطبیعیاتی سوالات موجود نہ رہے ہوں جس میں خدا اور آخرت کے تصورات نہ پائے جاتے ہوں جہاں خیر و شر کے مستقل اور معین پیمانے نہ ہوں، جہاں حق و باطل تاریخ کے ہر موڑ پر تبدیل ہوتا ہو۔ ان معنوں میں مغربی تہذیب جسے مارماڈیوک پکتھال تہذیب نہیں، بہیمیت [savegry] کہتے ہیں اور اسے کتے بلیوں کی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ دنیا کی واحد تہذیب ہے جو گناہ کو خیر کل، حقیقت کلی، حقیقت ازلی و ابدی سمجھتی ہے، وجود خدا کے ساتھ ساتھ وجود آخرت کا انکار کرتی ہے۔ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتی ہے اور اسی دنیا میں جنت تعمیر کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مغرب کی یہ مادی جنت سائنس و ٹیکنالوجی کی بیساکھیوں پر کھڑی ہے اور اس جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خادم بن کر شب و روز اس کی بیگار میں جت کر زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکیں اور پھر زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کر سکیں۔ خدا کی جنت میں نہ محنت ہے نہ مشقت نہ بھوک، نہ پیاس، نہ خوف، نہ ماضی کا خدشہ، نہ مستقبل کا اندیشہ، نہ لغو، نہ لہو، نہ لعب وہاں ہر چیز بلا معاوضہ ملے گی لیکن مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی کی مصنوعات پر مشتمل زمینی جنت پیسے کے بغیر نہیں مل سکتی لہٰذا اس عہد کا خدا اس کا عہد کا پیغمبر نعوذ باللہ۔ Capital ہے لہٰذا تمام انسانی رشتے تعلقات معاملات صرف اور صرف پیسے Capital کے ذریعے جانچے، ماپے اور ناپے جا رہے ہیں، پیسہ ہی منہاج علم ہے، پیسہ ہی وہ کسوٹی ہے جو معاشرے میں کسی فرد کے مقام و مرتبے کا تعین کرتا ہے لہٰذا پوری دنیا نفس پرستی کے مذہب پر ایمان لے آئی ہے اور پیسے کی دوڑ میں شریک ہو کر اپنی اقدار روایات، تہذیب، تاریخ، رسوم و رواج کو تاراج کر رہی ہے۔ اب جاوید احمد غامدی مغرب کے اس فلسفۂ مذہب انسانی، فلسفہ الوہیت حیوانی کی مذہبی تعبیریں پیش فرما رہے ہیں۔ جاوید غامدی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیکارٹ کے فکر پر مبنی فلسفے کی بنیاد محض شک ہے یہ انسانوں کے ذہن کی تخلیق ہے اس کا کوئی پہلو حتمی، قطعی اور آخری نہیں ہے یہ کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتا ہے یہ فلسفہ قرآن کی آیات نہیں جس میں تغیر و تبدیل کی گنجائش نہیں، پھر اس فلسفے کو قطعی اور حتمی ماننے کا جواز انھوں نے کہاں سے اخذ کیا ہے۔ فلسفہ کیا ہے، کسے کہتے ہیں مختصراً فلسفے کی اہم تعریفیں درج ذیل ہیں:

[1] "The love of wisdom." [2] "Philosophy is the name for a subject area of study". [3] Philosophy is a term to identify an individual's general approach to life". [4] Philosophy is the identification of the presuppositions and assumptions underlying a subject matter [for example, the philosophy of science, the philosophy of history, and so

forth]; [5] Philosophy as a techniques to clarify the way language is used. [6] Philosophy is an activity undertaken by human beings who are deeply concerned about who they are and what everything means, and that a philosopher is a person who perceives in some measure the ways in which the various experiences and awarenesses of existence form a pattern of meaning. [7] Philosophy, without apology, forcefully directs attention to the relentless efforts of human beings to achieve an organized view of themselves and the universe in which they live.

فلسفے سے ناواقف لوگوں کے لیے اس بیان کی مزید تشریح درج ذیل ہے:

"Philosophic study means the habit of always seeing an alternative". This statement, by the American philosopher William James, introduces another aspect of the issue approach to philosophy. The issue approach exposes students to a provocative variety of positions taken by philosophers on major questions. By examining this diversity of ideas students are forced to speculate about the range of the possible. The aim is to stretch the mind, to explore the realm of the conceivable. By scanning the horizon in many directions, students can more firmly fix their own positions or the positions of others.

فلسفہ ہمیشہ متبادل کا متلاشی رہتا ہے جو غامدی صاحب کا پسندیدہ مشغلہ ہے، فلسفہ ہر شے کو سوال کی تلوار پر رکھ لیتا ہے لیکن کسی سوال کا حتمی قطعی جواب نہیں دیتا۔ کھلا ذہن فلسفہ کا ثمر ہے جس کا مطلب ہے ایک ایسا آدمی جس کا منہ ہمیشہ کھلا رہے جو ہمیشہ سوالات اٹھاتا اور اعتراضات کرتا رہے۔ غامدی صاحب کا یہی طریقہ کار ہے جسے فلسفہ کی تعلیم کے دوران غامدی صاحب نے طرز حیات کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔

The philosophy questions everything and settles nothing, some reassurance may be found in the words of the late English journalist-critic G.K. Chesterton, who remarked: "Merely having an open mind is nothing. The object of opening the mind, as of opening the

mouth, is to shut it on something solid."

فلسفے کی ان مغربی تعریفوں کے بعد جاوید غامدی صاحب یہ بتادیں کہ حقوق انسانی کے مغربی فلسفیانہ منشور کو ایک اسلامی آفاقی منشور کیسے تسلیم کیا جائے؟ غامدی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مغرب کے بڑے بڑے فلاسفہ نے حقوق انسانی کے منشور کو آفاقی [Universal] تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ عصر حاضر کے سرکاری امریکی لیکن اہم فلسفی رچرڈ رارٹی کہتے ہیں کہ یہ ایک خاص تاریخ وتہذیب سے برآمد ہوتے ہیں اور ان کو آفاقی کہنا ٹھیک نہیں ہے لیکن غامدی صاحب نے کبھی ان فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا۔ آئندہ شمارے میں ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کریں گے۔ جن میں حقوق انسانی کے منشور کو آفاقی تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ جس منشور کو مغرب کے دانشور فلسفی آفاقی نہیں مانتے۔ غامدی صاحب اسے آفاقی اسلامی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس سے ان کی جہالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

غامدی صاحب Humanism کا ترجمہ انسانیت نوازی کرتے ہیں۔ Humanity کا ترجمہ انسانیت کرتے ہیں اور اسے عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی بھی زبان اور فلسفے کے خیالات [Ideas] اور اصطلاحات [Terminology] کا ترجمہ یا ترجمانی کسی دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں۔ انھیں ترجمے کی تنگ دامانی کا اندازہ ہی نہیں وہ زبانوں کے تراجم کی تاریخ، تراجم کی مشکلات سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کی تفصیل آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔ سردست ہم ان کے تصور انسانیت پر گفتگو کریں گے۔ مغرب میں کوپرنیکس کی کتاب سیاروں کی گردش The revolution of Celestial Spheres نے سائنسی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا جس کے باعث یونانی سائنس کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت بھی منہدم ہوگئی۔ کیونکہ عیسائیت نے یونانی منطق، فلسفے اور سائنس سے مرعوبیت کے باعث یونانی سائنسی منطق، فلسفیانہ، افکار ومعتقدات کو عیسائی دینیات والٰہیات کا حصہ بنالیا تھا۔ اس بدعت وگمراہی کے نتیجے میں یونانی سائنس کا یہ احمقانہ مفروضہ کہ ''زمین ساکن ہے'' عیسائی عقائد کا لازمی حصہ قرار پایا جسے کوپرنیکس نے علماً اور عملاً غلط ثابت کر دیا۔ اصلاً کوپرنیکس نے یونانی سائنس کی تردید کی تھی۔ لیکن اس کے نتیجے میں عیسائیت بھی رد ہوگئی اور مذہبیت کے خلاف سائنسی انقلاب برپا ہوگیا۔ کوپرنیکس نے پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ اجسام سماوی زمین کے گرد گردش نہیں کرتے بلکہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ کانٹ نے اسی کوپرنیکسی انقلاب کو مابعد الطبیعیات اور علمیات میں برپا کیا اور اس نے تمام گردش کا محور انسان کو قرار دیا۔ دنیا کی اکیس تہذیبوں میں خدا مرکز ومحور کائنات رہا اسے God procentic approach کہا جاتا تھا۔ کانٹ نے تاریخ فکر انسانی میں پہلی مرتبہ اس فکر کو تبدیل کر کے انسان کو محور مرکز کائنات قرار دے کر ایک نئے مذہب، نئی مابعد الطبعیات، کی بنیاد ڈالی جسے ہم آج مذہب انسان پرستی [Religion of human worship] کے نام سے جانتے، پہچانتے اور بلاتکلف اس پر

ایمان لاتے ہیں۔ دیر و حرم کا اس مذہب پر اجماع ہو گیا ہے۔ روایتی طور پر مابعد الطبیعیات کا تعلق خدا کائنات اور روح اور تصور خیر و شر سے ہے۔ لیکن کانٹ نے اس مابعد الطبیعیات کو نقد کا نشانہ بنا کر مغربی بہیمیت کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ اس کے خیال میں Metaphysic انسانی خود مختاری میں حائل ارادہ انسانی کی تحدید، اور انسان کے عقل کل ہونے کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا انکار ضروری ہے۔ کانٹ نے بتایا کہ انسان کو صرف اپنی اتباع کرنی چاہیے یعنی انسان اپنے self کی پرستش کرے کیونکہ وہ خود پرستش کیے جانے کے قابل ہے وہ خود خدا ہے، خود خیر و شر کا ماخذ ہے اور اس کا نفس کائنات کے اسرار و رموز کا امین ہے اس اتباع کا نام خود مختاری و آزادی Self] [determination, independence] ہے۔ خدا ہے یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وجود خدا ثابت بھی ہو جائے تب بھی انسان کو خدا کے بجائے اپنے نفس کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ کانٹ کے اس فلسفے سے [Religion of humanism] کی بنیاد پڑی اور غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب انسانیت عین اسلام ہے۔ کانٹ نے یہ فلسفہ افادیت پسندی کے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اس کے خیال میں کسی بھی شے کے حق یا باطل، صحیح یا غلط ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ شے انسان کے لیے فائدہ مند ہے یا نہیں جو چیز انسان کے لیے فائدہ مند ہے وہ حق ہے خواہ خدا کچھ بھی کہے سوال یہ ہے کہ انسان کے لیے کیا فائدہ مند ہے کیا نقصان دہ اس کا تعین خود انسان کا Self نفس کرے گا یا کوئی اور کانٹ کہتا ہے کہ منہاج خیر و شر نفس انسانی ہے گویا خواہش نفس ہی الٰہ ہے جسے قرآن شرک کی بدترین قسم قرار دیتا ہے ایسے شخص کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوتی۔ جو اپنے نفس کا بندہ ہو۔ کانٹ کے اس فلسفہ مذہب انسانیت کی تفصیلی تشریح آپ اگلے مضمون میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جس سے جاوید غامدی صاحب کی فلسفے سے ناواقفیت اور اسلام سے جہالت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ مختصراً کانٹ کی نظر میں سب سے ذلیل انسان وہ ہے جو اپنے نفس کے سوا کسی اور کے سامنے سر جھکائے خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو۔ ارادہ الٰہی کوئی خیر نہیں اصل خیر ارادہ انسانی ہے۔ اخلاقیات کی بنیاد ارادۂ الٰہی یا فطرت نہیں بلکہ ارادۂ انسان ہے۔ انسان صرف اپنے بنائے ہوئے قوانین کا فرماں بردار ہے اس کے سوا کوئی فرماں برداری جائز نہیں۔ انسان کا اصل مقصد مفادات انسانی اور خود مختاری کا تحفظ ہے لیکن بے چارے غامدی صاحب اور ان کے ہم خیال جاہل مسلم مفکرین مذہب حقوق انسانی کو عین اسلامی ثابت کر رہے ہیں۔

جاوید غامدی صاحب کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی پڑھ لی اور فلسفہ بھی ایک جزوی مضمون کے طور پر زیر مطالعہ آیا۔ لہٰذا فلسفے کے گمراہانہ خیالات سے متاثر ہو گئے اسی لیے افلاطون نے کہا تھا کہ چالیس سال کی عمر تک فلسفہ پڑھنا چاہیے تب فلسفے کی تعلیم مکمل ہو گی اور اس کے بعد دس سال تک King فلسفی کو عام لوگوں سے تمام امور پر تبادلہ خیال کرتے رہنا چاہیے تاکہ اس کا تزکیہ اور تصفیہ قلب ہو سکے کیونکہ فلسفہ ایک خطرناک ہتھیار ہے جس سے فلسفی اپنا گلا بھی کاٹ سکتا ہے

اور دوسروں کا بھی۔ افلاطون کے یہاں بادشاہ کا فلسفی ہونا ضرور تھا تا کہ وہ دانش و بینش سے کلی طور پر آگاہ ہو۔ غامدی صاحب نے ۲۵ سال کی عمر میں علم بگھارنا شروع کیا لہٰذا اپنا اور عالم اسلام کا گلا فلسفہ کے اس کند ہتھیار سے خود ہی کاٹ ڈالا۔ افلاطون کا اندیشہ کئی صدیوں کے بعد درست ثابت ہوا۔ غامدی صاحب فلسفہ پڑھتے ہی مسند درس وارشاد پر بزعم خود فائز ہو گئے۔ جہلا ان کے اردگرد جمع ہو گئے، ان اجہلوں میں یہ راجہ اندر تھے لہٰذا سب ان کے غرورِ علم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور جاہلوں کا ایک کاروان تیار ہو گیا جو نہ عربی جانتے ہیں نہ علوم اسلامی سے واقف ہیں نہ مغربی فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس جاہلیت اور جہالت کے باعث غامدی صاحب نے مغربی فلسفیانہ اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ پڑھ کر مغرب کے تمام ملحدانہ و کافرانہ خیالات کی اسلام کاری شروع کر دی۔

''تصورات کا اصل زبان میں باقاعدہ اور دِقت نظر سے مطالعہ کئے بغیر محض ترجمے کی بنیاد پر کسی قوم کی اخلاقیات، مابعد لطبیعیات، اعتقادات، الٰہیات کی نوعیت پر گفتگو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے مثلاً صالح کا ترجمہ راست باز یا رائیٹیس [Rightiuous] درست نہیں یہ لفظ معنویاتی عناصر میں انگریزی کے اسم صفت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا اسی طرح شنٹو اور کنفیوشس مذہب میں راستی اور انصاف کے تصورات کا انگریزی میں درست ترجمہ ممکن ہی نہیں کیونکہ جاپانی اور چینی زبان میں متعدد ایسے الفاظ ہیں جو انصاف اور راستی کے مفہوم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انگریزی زبان اور ان مذہبی اصطلاحات میں موجود مبہم اشتراک اور ترادف کی بنیاد پر کیا گیا تقابلی مطالعہ جہالت کا مظہر ہوگا یہی حال غامدی صاحب کا ہے مغربی فکر و فلسفے اور تہذیب کی اصطلاحات کا ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ پروفیسر Morris Cohen نے اپنی کتاب A preface to logic میں لکھا ہے کہ ارسطو کے نیک آدمی کا تصور ''یونانی لفظ ''آرے تے'' کو انگریزی لفظ virtue کا مترادف، متبادل، مرادف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے آرے تے کا بہتر مفہوم نیکی virtue نہیں عمدگی ہے جو قابل ستائش خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ ہائیڈیگر کے متن کے بعض حصوں کے انگریزی میں ترجمے آج تک نہیں کئے جا سکے۔

کسی زبان کے ترجمے کے ذریعے اصل زبان کے متن کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوتی ہیں وہ بالواسطہ ہوتی ہیں اور ان پر قطعی انحصار نہیں کیا جا سکتا ترجمے میں الفاظ جملے اگر اصل عبارت کے قریب ہوں تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ جزوی مطابقت ظاہر کرتے ہیں اس ترجمے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا یہ ناکافی اور بعض صورتوں میں گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

اگر کوئی عبارت ہم اصل زبان میں بھی پڑھتے ہیں تو قطعاً لاشعوری طور پر ہم اس عبارت میں اپنے ہی تصورات، معتقدات، نظریات، ایمانیات، افکار، روزمرہ، اقدار، روایات پڑھنے لگتے ہیں جو ہماری مادری زبان، تہذیب، مذہب اقدار روایات نے ہمارے ذہن پر نقش کئے ہیں چنانچہ ہم اس عبارت کے اگر سارے نہیں تو بہت سے کلیدی الفاظ کے مفہوم کو اپنی مادری زبان میں دستیاب ملتے جلتے تصورات میں تبدیل کر کے سمجھ رہے ہوتے

ہیں۔

کسی اجنبی زبان کے الفاظ اصطلاحات کا مطلب معلوم کرنے کا عام اور سب سے سادہ طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس لفظ کا مترادف اور ہم معنیٰ لفظ تلاش کیا جائے بدقسمتی سے یہ طریقہ علمی حلقوں اور خصوصاً فلسفیانہ موضوعات اور اصطلاحات کے ضمن میں سب سے زیادہ غیر معتبر ہے۔ غامدی صاحب کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ انھوں نے مغربی فلسفے، ثقافت، تہذیب کی اصطلاحات کا اردو ترجمہ پڑھ کر ان کے وہ مفاہیم اپنے ذہن میں نقش کر لیے جو اسلامی تاریخ و تہذیب کی جلوہ گری سے متعلق ہیں۔ غیر زبان کا لفظ صرف لفظ نہیں ہوتا اس لفظ کی ایک خاص تاریخ تہذیب ثقافت، مابعد الطبعیات بھی ہوتی ہے۔ لفظ یا اصطلاح کا خمیر اس خاص تاریخی تناظر سے تیار ہوتا ہے اسے نظر انداز کر کے جو ترجمہ بھی کیا جائے گا وہ بے کار نا قابل قبول ہوگا جیسے مغربی اصطلاح مارکیٹ کا ترجمہ بازار، فریڈم کا ترجمہ آزادی، Equality کا ترجمہ مساوات Tolerence کا ترجمہ رواداری، ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہور یا جمہوریت یا اجماع سراسر غلط ہے تصورات [Ideas] اور اصطلاحات [Terminology] اور اسماء کا تو ترجمہ ممکن ہی نہیں جس طرح اذان، حج، السلام علیکم محمد کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ اس تناظر کو رد کر کے آپ صرف لفظ کو غیر اقداری [Value Neutral] سمجھ کر ترجمہ کرتے ہیں تو قیامت آ جاتی ہے۔ مثلاً عربی لفظ حماسہ کا مطلب میدان جنگ میں شجاعت، مصیبت میں صبر، حصول انتقام میں ثابت قدمی، کم زور کی حفاظت اور طاقت ور کے خلاف بغاوت کے سارے مفاہیم کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مگر حماسہ کے سارے معانی کا احاطہ نہیں بلکہ ایک بہت ہی سرسری سا اور ابتدائی تخمینہ ہے لیکن یہ ابتدائی معانی بھی بہادری جرات یا حوصلے کے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتے جو عام طور پر حماسہ کے ترجمے کے لئے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح لفظ جہل جسے عموماً علم کی ضد سمجھا جاتا ہے لیکن اصلاً یہ صرف علم کی نہیں بلکہ علم اور حلم کی ضد ہے۔ نفس کا سکون یونانی میں اتارکسیا Ataraxia کہلاتا ہے اس کا اردو ترجمہ ممکن نہیں ہر زبان میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات ہوتے ہیں جن کا ترجمہ ممکن نہیں مثلاً انگریزی کے لفظ Humor فرانسیسی کے لفظ Esprit اور جرمنی کے Gemut عربی کا حماسہ، یونانی کا آرے تے Arete کا صحیح اور مکمل ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں۔ انگریزی لفظ Weed کے معنیٰ غیر ضروری ناپسندیدہ نباتات خودرو سبزہ کا ایسی جگہ اگنا جہاں اس کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ ہی اصل میں کافرانہ ہے یہ لفظ وہ شخص کہہ سکتا ہے جو فطرت کائنات اور حقیقت کے نظریات سے لاتعلق ناواقف ایک خاص ذہنی مریض ہو جو خاص مابعد الطبعیات کا خوگر ہو۔ یونانی لفظ Logos کا ترجمہ بھی ممکن نہیں ڈاکٹر فاؤسٹ نے ہمت ہار دی تھی جب وہ گوئٹے کی کتاب کا ترجمہ کر رہے تھے۔ نا قابل ترجمہ الفاظ دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے کے حامل ہوتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ کسی لفظ کا بھی مکمل ترجمہ دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں۔

اگر غامدی صاحب نسبتی لسانیات Ethnoliguistic سے واقف ہوتے اور دوسری زبانوں کے

تصورات اصطلاحات ، الفاظ کے ترجمے کے ضمن میں Proheo Weisberger کی کتاب Vom Weltbild der deutschen Sprache اور پروفیسر Edward spepir کے Ethnoliguistic سے متعلق خیالات کا مطالعہ کر لیتے تو مغربی فلسفے اور انگریزی زبان کی اصطلاحات کے غلط سلط ترجمے کر کے بنیادی انسانی حقوق Fundamental Human Rights کو اسلامی ثابت نہ کرتے اور جاہلیت زدہ مغربی تہذیب وفلسفہ کو اسلام کی اصل شکل اور توسیع شدہ قوت قرار نہ دیتے۔

غامدی صاحب نے Donal Evance کی کتاب The logic of Involvment اور Bejamin Lee Wharf Language Thought & Reality [Cambridge 1956] اور Paul Henle کی کتاب Language Thought & Culture کا مطالعہ نہیں فرمایا۔ بینجمن وہارف کے خیال میں مغربی اور ہند یورپی زبان بولنے والوں کی دنیا بالکل الگ الگ ہے مغرب کے یہاں گول مربع مستطیل مکعب، ٹھوس، مائع کی درجہ بندی یکساں ہے جب کہ ہند یورپی زبان بولنے والوں کے یہاں اس کے اصول الگ ہیں وہ کہتا ہے کہ مغربی اقوام کی درجہ بندی کے اصول غیر منطقی اور غیر معقول ہیں کیوں کہ وہ حقیقی دنیا کے نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔

بنجمن وہارف کو حیرانی ہوئی کہ ہند یورپی زبانیں بولنے والوں سے الگ ایک ایسی دنیا بھی موجود ہے جو چیزوں کی درجہ بندی ان کی بنیادی شکلوں یعنی گول، مربع، مستطیل، مکعب، ٹھوس، مائع وغیرہ کے حساب سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گول چیزوں کی درجہ بندی مربع چیزوں کے ساتھ نہیں ہوسکتی، ان دونوں کے لیے الگ الگ نام ضروری ہیں۔ ان کے حساب سے مغربی اقوام کی درجہ بندی کے اصول غیر منطقی اور غیر معقول ہیں کیونکہ وہ حقیقی دُنیا کے نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ گول اور مربع دو مختلف اشیاء کو ایک ہی درجہ میں رکھنا کیسے ممکن ہے؟

اس سادہ سی مثال سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ نام اور چیز میں مطابقت کسی مادی، معروضی، سادہ اور یکتا بنیاد پر نہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک مخصوص ذہنی عمل کارفرما رہتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے کسی چیز کو داخلی حوالے سے شکل دیتا ہے۔ میز کی مثال میں یہ مخصوص زاویہ اس چیز کی عملی افادیت کا پہلو ہے، اس میں میز کی مربع یا گول شکل کا اختلاف بے معنی ہے۔ اس کے استعمال کی بنا پر دونوں شکلوں کو ایک نام دیا گیا۔ چونکہ دونوں شکلوں کے میز ایک ہی مقصد کے لئے ہیں، اس لئے ظاہری اور صوری اختلاف قدرتی طور پر غیر اہم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے نزدیک چیزوں کی شکل وصورت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ دُنیا کو شکل وصورت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، مقصد اور استعمال کی بنیاد پر نہیں۔

ڈاکٹر فاؤسٹ گوئٹے کی کتاب کے ترجمے میں یونانی لفظ Logos کا جرمن معنی تلاش کرتے کرتے

تھک گیا اس تھکن اور اس مشکل کا اصل سبب یہ تھا کہ 'نا قابلِ ترجمہ' الفاظ دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم اس مخصوص رویے کی یہ چند مثالیں محض وضاحت کے لیے پیش کی گئیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کسی لفظ کا بھی مکمل ترجمہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ میز کا ترجمہ آسان اور لوگوں کا مشکل ہے، لیکن دراصل یہ فرق اتنا زیادہ نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ صحیح معنوں میں دونوں کا ترجمہ مشکل ہے۔

ہم جو لفظ بھی بولتے ہیں، وہ ہمارے اس مخصوص زاویۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں جس سے ہم اس لفظ کا تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور اسی داخلی رویے کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ زاویۂ نظر مختلف چیزوں کی شکلیں تیار کرتا ہے جو کم وبیش مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی شکلوں کو ہم تصور کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں زاویۂ نظر کے داخلی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر فرد کا اپنا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ ہم جس زاویۂ نظر کی بات کر رہے ہیں، وہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے کیونکہ پورا معاشرہ اس میں شریک ہے۔ یہ ایسا مشترکہ سرمایہ ہے جو نسل در نسل تاریخی روایت کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ ہم اسے داخلی اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس کی تشکیل میں کسی حد تک ایجابی ذاتی مفاد کو دخل ہے جس کی وجہ سے کائنات کے بارے میں یہ تصوراتی تصویر باہر کی دنیا کے ٹھوس حقائق کی بعینہٖ نمائندگی نہیں کرتی۔ علمِ معنویات انہی زاویوں کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے جو لفظ اور تصور کے باہمی رشتے کے ذریعے معانی پیدا کرتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ہر قوم اپنے طریقے سے طے کرتی ہے کہ حقیقت کے کُل میں سے کیا الگ کرنا ہے اور کس حساب سے کرنا ہے۔ یا یوں کہیے کہ صورتوں کو الگ کرنے کے عمل کا انحصار ہمیشہ کسی قوم کی داخلی دلچسپی کے معیار پر ہوتا ہے۔ یہی معیار اس عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ تعین مادی اشیاء میں معروضی طور پر باہمی مشابہت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس داخلی معیار پر ہوتا ہے جس سے ان چیزوں کی خانہ بندی کی جاتی ہے۔ حقیقت کا جو روپ ہماری اُمید وبیم، رغبت وتصمیم اور خواہش وعمل کو اہم دکھائی دیتا ہے، صرف اسی کو الگ اور مستقل جزو کی حیثیت سے ایک الگ نام دے کر ایک الگ حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔ اس ذہنی حقیقت کو ہم 'تصور' کہتے ہیں۔ ہر لحہ تیزی سے بدلتے بہتے تاثرات میں سے ہم صرف ان چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ذاتی داخلی دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں، یا ہم جنہیں نظامِ زندگی کے لیے مجموعی طور پر لازمی سمجھتے ہیں۔ اس طرح ہم ان چیزوں کو جو ایک غیر متعین اور ہر لحہ تغیر پذیر کل کا جز ہیں، اپنے اس نقطۂ نظر سے متعین کرنے کی غرض سے اس کے لیے ایک لفظ مخصوص کر دیتے ہیں۔ اس لغوی چھاپ کے عمل کو 'نام' کہا جاتا ہے۔

کائناتی وجود کے مواد کو جو دراصل بے شکل ہے، انسانی ذہن اَن گنت خطوط کھینچ کر مختلف خانوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ حقائق کی دنیا پر لسانی اور تصوراتی تقسیم کے نقوش ثبت کر دیے جاتے ہیں۔ اور یوں

اصلاً ایک بے ہنگم وجود کو ایک نظام اور ترتیب دے دی جاتی ہے۔ تصورات اور الفاظ جو اُن تصورات کے اظہار کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مل کر ایک پیچیدہ نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نظام متعدد مظاہر میں نظر آتا ہے۔ یہ نظام انسانی ذہن اور مادی اشیاء کے درمیان ایک پردہ بن جاتا ہے۔ جو حقیقی وجود کی جگہ تصورات کے ذریعے تشکیل دیے ہوئے وجود کو منعکس کرتا ہے۔ پردے کے اس مخصوص عمل کی وجہ سے انسانی ذہن تک جو حقائق پہنچتے ہیں، اُن کی شکل ترمیم شدہ حتیٰ کہ بعض اوقات بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔

ہم حقائق کو اس پردے کے ذریعے دیکھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ یہ پردہ ہمیں بالکل شفاف اور قدرتی لگتا ہے اور پھر بتدریج ہمیں اس کے وجود کا احساس بھی نہیں رہتا۔ اپنی سادہ لوحی میں ہمیں پورا یقین ہوتا ہے کہ ہم حقائق کی دُنیا کو بالکل اُسی طرح محسوس کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ فطری طور پر اصل میں ہے، اور ہم اسے براہِ راست دیکھ رہے ہیں۔ عام فہم نقطۂ نظر کے حساب سے فطری اور حقیقی، دُنیا اپنے اظہار کے پیرایوں اور گوناگوں تنوع کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے بدیہی طور پر موجود ہے۔ ہم اسے بالکل اسی تفصیلی درجہ بندی اور مکمل نظم کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ وہ اصل میں ہے۔ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم دُنیا کا ادراک جس ترتیب اور تقسیم سے کر رہے ہیں، وہ اصل میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ ہم اس فطری تنوع اور تقسیم کے مطابق اپنے ذہن میں تصورات قائم کرتے ہیں، چیزوں کو نام دیتے ہیں اور اس طرح ہمارا ذخیرۂ الفاظ تشکیل پاتا ہے۔

یہ عام فہم نقطۂ نظر ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ حقیقت کلی کا ادراک تو ایک طرف [اسے تو یونانی حکماء بھی فوضیٰ یا بدنظمی کا نام دیتے تھے]۔ ہم حقیقت کے کسی ایک جز کا بھی صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم حقیقت کے کسی بھی پہلو کو جتنے اجزا میں چاہیں اور جس طرح چاہیں اور جس زاویے سے چاہیں تقسیم کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ وجودی فلسفی کہتے ہیں کہ زندگی کے ہر لمحہ بہ لمحہ تجربات و واقعات کے خام مواد کو جب تک ہم اس ذہنی عمل کے ذریعے متفرق مستقل ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر لیتے، ہمیں یہ دُنیا قطعی طور پر بے صورت اور بے معنی لگتی ہے۔ تقسیم کے اس ذہنی عمل کو علم معنویات میں اظہار یا بیان [Articulation] کہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہم اظہار کا یہ عمل خود وضع کریں۔ یہ نظام ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہمیں استعمال کے لئے تیار ملتا ہے۔ یہ ذخیرہ ہمیں اپنے آباء واجداد کی جانب سے ثقافتی ورثے میں حاصل ہوتا ہے۔ بچپن میں جب ہم مادری زبان سیکھتے ہیں تو یہ ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔

وجود کی حقیقت کچھ بھی ہو، وہ ہمارے تصور میں اپنی اصلی اور فطری شکل میں نہیں نظر آتا، بلکہ وہ ہماری زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود علامات کے منشور سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ علامت کا یہ منشور اصل کا عکس نہیں ہے اور نہ ہی علامات حقیقت کی اصل شکل سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ تو تصوراتی شکلیں ہیں، لیکن صرف انہی کے واسطے سے کوئی چیز ہمارے عقلی ادراک میں حقیقت کی شکل دھارتی ہے۔

اس ضمن میں سب سے اہم قابلِ غور بات صرف یہی نہیں کہ کائنات کو مختلف اکائیوں میں تقسیم و تفریق کا ہر قوم کا اپنا طریقہ ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ یہ اکائیاں مل کر جو نظام تشکیل دیتی ہیں، وہ بھی ہر قوم سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ نظام کسی ترتیب اور اصول کے بغیر وجود میں نہیں آتے بلکہ یہ اکائیاں مل کر ایک بہت ہی پیچیدہ اور منظّم کل بناتی ہیں۔ اس قوم کا خاصہ صرف وہ نظام ہی نہیں، جس میں یہ اکائیاں ایک دوسرے سے جڑی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ہر قوم اپنے مخصوص طریقے سے یہ تعین کرتی ہے کہ کس اکائی کی کیا ماہیت ہے اور اس کا درجہ اور مقام کیا ہے۔ یہ منظّم کل ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہر قوم کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ یا عام الفاظ میں زبان یا لغت دلالت کے مختلف پیرایوں پر مبنی اظہار اور بیان کی شکلوں کے نظام کا نام ہے جس کے ذریعے ہم ہر لحہ بدلتی کائنات کو اشیاء اور واقعات کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

بنجمن وہارف کا خیال ہے کہ ہر زبان حقیقت کے وقتی تجزیے کا نام ہے کیونکہ ہر زبان کائنات اور فطرت کے وجود کو مختلف طریقوں سے اکائیوں میں بانٹتی ہے حتیٰ کہ ایک عام سا واقعہ بھی مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے بیان ہوتا ہے کیونکہ یہ زبانیں اس واقعے کو حقائق کے مختلف پیمانوں سے ناپتی ہیں۔ ہر زبان اپنے طریقے سے ان اکائیوں کو گروہ بندی کے مختلف قسم کے متعدد بنیادی اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہیں۔ پھر اُن کی مدد سے تصورات کا ایک مربوط جال بُنا جاتا ہے۔ اس جال کو ذخیرۂ الفاظ کہتے ہیں۔ تصورات کو بیان کرنے کا جال یعنی ذخیرہ الفاظ جب صرف انسانوں کے فہم، علم، عقل، نفس، تجربات پر انحصار کرتا ہے تو ایک خاص زمان و مکان میں مقید، محدود، محصور اور مجتمع رہتا ہے لیکن اظہار بیان جب وحی الٰہی اور پیغمبروں کے ذریعے عمل میں آتا ہے تو یہ پیغام، اس کی زبان، صرف مقامی نہیں رہتے آفاقی ہو جاتے ہیں اور زماں و مکاں کی قید سے اوپر اٹھ جاتے ہیں اس لیے تمام انبیاء کا پیغام کل عالم کے لیے ایک ابدی حقیقت کو پہچاننے کا پیغام ہے اور تمام انبیاء کی دعوت، اسلوب، پیغام، ہدف، منزل بنیادی طور پر ایک ہی رہی ہے لہٰذا وحی الٰہی اور ذات محبوب الٰہی ہی وہ مستند ذریعہ ہے جو محدود زبان کے ساتھ ایک آفاقی خیالات، آفاقی تصورات اور آفاقی پیغامات کی ضمانت ہے۔

کسی بھی زبان کا ذخیرۂ الفاظ یا نظامِ دلالت ایک مخصوص تصورِ کائنات سے مجسم ہوتا ہے اور اسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تجربے کے خام مواد کو ایک بامعنی اور تعبیری دُنیا میں تبدیل کرتا ہے۔ ان معنوں میں ذخیرۂ الفاظ صرف ایک سطحی عمارت نہیں بلکہ یہ ذیلی درجہ کے ذخیرۂ الفاظ کی متعدد سطحوں پر تعمیر کی گئی ہے جو عام طور پر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں بنی ہیں، لیکن اکثر ان کے رقبے باہم مشترک بھی ہوتے ہیں۔ اشتراک کا بنیادی سبب ہر قوم میں انبیاء کی آمد اور ان کا مشترکہ پیغام حق بھی ہے اس لیے بنیادی اخلاقیات تمام تہذیبوں میں کم سے کم قدر مشترک ہے۔''

غامدی صاحب کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی انگریزی زبانوں اور فلسفے میں عبور حاصل کیے بغیر

کچے پکے خیالات ترجمہ کے ذریعے سرقہ کیے اور یہ ترجمہ بھی تسامحات سے پر تھا لہٰذا وہ مغرب کی تفہیم سے قاصر رہے اور عربی زبان پر عدم عبور کے باعث علوم اسلامی کی اصل تک نہ پہنچ سکے۔

ترجمے کے فن سے ناواقفیت کے باعث جناب جاوید غامدی صاحب نے وہ بھیانک غلطیاں کیں جو اسلامی تاریخ وتہذیب میں سرسید، عبدہٗ اور غلام احمد پرویز سے بھی سرزد نہ ہوئیں۔ کیونکہ ان حضرات نے فلسفے کے میدان میں سفر سے گریز کیا۔ غامدی صاحب اترا کر چلے اور چکرا کر گرے۔ اور پھر گرتے ہی چلے گئے۔ جب کوئی چیز نشیب کی طرح چلتی ہے تو لڑھکتی چلی جاتی ہے، کسی گہرائی میں گرتی ہے تو پاتال تک گرتی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

غامدی صاحب مغربی تہذیب اور اس کی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں لہٰذا وہ مغرب سے آنے والے ہر خیال، ہر تصور اور نظریے کی اسلام کاری پر تلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مغربی فلاسفہ کی مغرب کے فلسفے، سائنس و ٹیکنالوجی پر تنقید نہیں پڑھی۔ مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں پر مغرب کے اہم لوگوں کی تنقید سے وہ ناواقف ہیں لہٰذا مغرب پر ایمان بالغیب کے ساتھ وہ اپنے فکری ایمان کا اعلان کر کے اپنے علمی سفر کا آغاز کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اگر وہ صرف ہزرل کی کتاب Critiques on uropeans sciences اور ہائیڈیگر کی کتاب Question Concerning Technology پڑھ لیتے تو ان کے بہت سے شبہات رفع ہو جائے۔ مغرب کے فلاسفہ کا خیال ہے کہ جدید انسان ایک قسم کی غلامی سے آزاد ہو کر دوسری قسم کی بدترین غلامی یعنی مشین اور ٹیکنالوجی کا غلام بن گیا ہے۔ مطلقیت اور آفاقیت کے خواب بکھر گئے۔ اس کی جگہ اضافیت بے معنویت، بے مقصدیت، بے اطمینانی، بددلی بے زاری، سکہ رائج الوقت بن گئے، کسی لفظ کے کوئی معنی نہیں چنانچہ کسی خیال کسی قدر کے کوئی معنی نہیں لہٰذا کسی قدر کسی نقطہ نظر، کسی فکر کسی گفتگو، کسی سوچ، کسی خواہش کے کوئی معنی نہیں، جس تہذیب وتاریخ نے یہ نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں۔ غامدی صاحب اس تہذیب کی برتری کے لیے کوشاں ہیں اور عالم اسلام کو مغرب بیانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ جدید طرز زندگی کے مظاہر و آثار پر ایرش فرام کے نقد سے غامدی صاحب ناواقف ہیں اگر وہ فرام کی کتابوں

[1]The sane society 1995. [2] The Revolution of hope. [3] Escape from freedom 1941. [4] The art of Loving 1956. [5] The forgotten Language 1960, [6] To have or to be.

کا مطالعہ کر لیتے تو ان کے بہت سے واہمے دور ہو جاتے، وہ بتاتا ہے کہ جدید تہذیب نے ایک غیر ہوش مند معاشرے کو جنم دیا ہے۔ عقل کی خدائی نے انسان کو تاریخ کی بدترین غلامی میں مبتلا کر دیا ہے۔ سرمایہ داری اور صنعتی دور نے انسان کی اصل فطرت، اور جذبات کو مسخ کر دیا ہے۔ جدید انسان غیر صحت مند بیمار مریض ہے۔ مادی

آسائشوں کا طلب گار جدید انسان ایک دوسرے کو کچلنے میں مصروف ہے۔ بے اندازہ مادی ترقی اس کے زوال کا اہم عنصر ہے۔ جدیدیت نے نئے مذہب کو جنم دیا ہے جس کا نام ترقی ہے جو انسان کو خدا کی بستی کے بجائے ترقی کی بستی اور غلامی کی پستی تک پہنچاتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے ثابت کر دیا ہے کہ Great Promise عظیم وعدہ ایک فریب تھا کیونکہ لامحدود لذات کا حصول لامحدود بے چینی، لامحدود گناہ گار زندگی، لامحدود بیماریوں، تکالیف، خباثتوں کو جنم دینے کا باعث ہے۔ اس کے خیال میں عصر حاضر کے انسان کی بنیادی بیماری حاصل کرنے [To achieve] کی خواہش ہے۔ حرص، لالچ، بے اطمینانی ایک نہ مٹنے والی بھوک ایک نہ مٹنے والی پیاس عہد حاضر کے انسان کا مقدر بنادی گئی ہے جس کا اصل سبب مغربی و یورپی سائنس وٹیکنالوجی ہے۔ جدیدیت نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا ہے جو زندگی کو خودکشی کی راہوں پر لے جارہی ہے۔ فرام نے مغرب میں انسانوں پر جبر کی طویل کہانی بھی تحریر کی ہے۔ جدیدیت، مغربی فلسفے، مغربی سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی نے یک رخے انسان کو جنم دیا ہے جو جاوید غامدی کا پسندیدہ انسان ہے۔ اس انسان کی بیخ کنی ہربرٹ مارکوزے [Herbert Marcuse] نے اپنی کتاب One dimensional man میں کی ہے۔ مارکوزے کا تعلق فلسفے کے فرانکفرٹ اسکول سے ہے مارکوزے کی کتاب انسانی تہذیب کے عروج و زوال کی ایک المناک داستان اور صنعتی انقلاب اور روشن خیالی [Enlightenment] کے دور کی پرسوز کہانی ہے۔ اس کے خیال میں انسانی تہذیب کا تنزل سترہویں صدی کی روشن خیالی کے دور سے شروع ہوگیا۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں اب مزدور کے لیے دو وقت روٹی حاصل کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن انسان سائنس وٹیکنالوجی کی چکاچوند میں دیکھنے، کہنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوگیا ہے۔ یہ سائنس وٹیکنالوجی بدترین انسان دشمن ہے۔ مزدوروں کے اعلیٰ معیار زندگی نے سرمایہ داروں اور سرمایہ داری پر تنقید کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ معاشرتی جبر تاریخ میں کبھی اس قدر نہ تھا جو جدیدیت کے ذریعے ہر جگہ در آیا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو دو کپڑوں میں خوش تھا اسے بیس جوڑے خریدنے پر اکسانا، جو پرانی کار ہی میں مگن تھا اسے نئی کار خریدنے پر مجبور کرنا، جو اپنی کٹیا میں مست تھا اسے عالیشان بنگلوں میں قرضوں کے ذریعے مقیم ہونے پر بھڑکانا عہد حاضر کا کمال ہے۔ ہر فرد سرمایہ، سائنس وٹیکنالوجی کی زنجیر غلامی میں باندھ دیا گیا ہے اور اس کے سحر میں مبتلا ہے۔ اسے زنجیریں، بیڑیاں نظر آرہی ہیں مگر وہ بخوشی اسے پہنتا چلا جا رہا ہے۔ سچی ضروریات کے بجائے چھوٹی ضروریات زندگی نے انسانوں کو بدترین اقتصادی غلام بنا دیا ہے۔ ٹیکنالوجی ضروریات کے لیے کام نہیں کر رہی بلکہ ٹیکنالوجی انسان کو بتا رہی ہے کہ اس کی ضروریات کیا ہیں؟ کیونکہ اس کا تعلق سرمایہ دار سے ہے اور سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بل پر لوگوں کو بتاتا ہے کہ کیا چیز لوگوں کی ضرورت ہے؟ کیا ضرورت نہیں ہے؟ لہٰذا انسان سرمایہ داری کے آہنی پنجرے میں بند ہوگیا ہے جس کا دوسرا نام روسی اور چینی اشتراکیت بھی ہے۔ فکر معاش ہر فکر پر فائق برتر اور غالب ہوگئی ہے۔ ہوس حسد کینہ حاصل زندگی ہے۔ مغرب کا

انسان اندر سے بے حد دکھی ہے، تنہا ہے، غمزدہ ہے اس کا دل بجھا ہوا ہے مگر فریاد نہیں کر سکتا یہ سب کچھ اس لیے کہ آلاتی عقل یا عقل معاون Insturnmental reason کو ہر قدر، فکر، نظریے پر بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔ عقل انسانی نے ایجادات و اکتشافات کا ایک ایسا جال بچھا دیا ہے کہ اس سے نکلنا اب اس کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ انسان تنقید عقل Critical Reason کا استعمال بھول گیا ہے۔ اس کی یہ صلاحیت جدیدیت مغربیت اور عیش و عشرت کی زندگی نے سلب کر لی ہے۔ وہ آلاتی عقل کا غلام ہو گیا ہے۔ عہد حاضر کا انسان تاریخ انسانی کا وہ بدترین اور بدنصیب انسان ہے جو اپنے اوپر تنقید کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ غامدی صاحب اگر مارکوزے کی درج ذیل کتابیں کا مطالعہ کریں تو شاید وہ مغرب کی اسلام کاری کے منصوبے سے تائب ہو جائیں۔

[1] Eros and Civilization 1955 [2] Reason and Revolution 1941. [3] One dimensional man - studies in the Ideology of adranced Industrial Soceity 1964. [4] Negations: Essays in Critical theory 1968. [5] Connter revolution and Revolt 1972.

عہد جدید کے انسان کے المیوں کی کہانی سننے، جاننے اور سمجھنے کے لیے غامدی صاحب روشن خیالی کی جدلیات کا مطالعہ کریں اور Adorno اور یاک ہائمر کی کتاب The dialectic of Enlightenment کا مطالعہ کریں تو وہ روشن خیالی کے فلسفے کو اسلامی ثابت کرنے کی خرافات سے بھی دستبردار ہو جائیں گے۔

عصر جدید کے سب سے بڑے فلسفی یرگن ہیبر ماس [Jurgen Habermas] کے افکار سے بھی غامدی صاحب قطعاً لاعلم ہیں۔ اس کی درج ذیل کتابیں:

[1] Towards a Rational Soceity: Student Protest, Science and Politic 1971 [2] Knowledge and Human Intrest 1972 [3] Theory and Practice 1973. [4] Legitimization Crisis 1976. [5] Communication and Evolution of Soceity 1979. [6] Theory of Communicative Action 1984. [7] The Philosphical discourse of Modrenity 1988. [8] Post Metaphysical Thinking 1992.

کا مطالعہ فرمالیں تو انھیں مغرب کی آفاقیت کے بہت سے دعوے غلط نظر آئیں گے۔ ہیبر ماس کی نظر میں Historical hermenuetic Sciences اور Emancipatory Sciences کی کیا اہمیت و حقیقت ہے۔ غامدی صاحب اس سے بھی قطعاً ناواقف ہیں۔ وہ مغرب کی تمام اقدار کو آفاقی اور اخلاقی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کے خیال میں بیشتر اقدار خواہ وہ اخلاقی ہوں یا سماجی، اضافی ہوتی ہیں اور ہر دم بدلتی رہتی ہیں۔

ہر چیز قطعاً خیر، حق، اخلاقی اور آفاقی نہیں ہوتی، فلسفہ افادیت پرستی اقدار اور چیزوں کی حیثیت وحقیقت کو بدلنے کا اصل سبب ہے۔ وہ جدیدیت کی سرمایہ دارانہ شکل، سرمایہ دارانہ نظام، صنعتی انقلاب اور ٹیکنالوجی کی بالادستی کے بجائے نجاتی عقل پر زور دیتا ہے جو ایک ایسی جدید تہذیب کو وجود میں لا سکے جس میں انسان مشینوں کی غلامی سے آزاد ہو، اس کے برعکس غامدی صاحب عالم اسلام کے ہر فرد کو مغربی مشینوں سائنس وٹیکنالوجی کا بے دام غلام بنانا چاہتے ہیں۔

غامدی صاحب نے Alwin Toffler کی کتاب Future Shock بھی نہیں پڑھی ورنہ وہ مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی اور جدیدیت کی حمایت سے دستبردار ہو جاتے۔ ٹوفلر لکھتا ہے کہ دنیا کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ امن کی کوئی ضمانت نہیں کب کیا ہو جائے گا کچھ پتہ نہیں، عصر حاضر میں معصوم بچے بڑے ہونے سے قبل ہی جوان ہو جاتے ہیں، بڑے اور بزرگ اب بچے معلوم ہوتے ہیں اور کمسن بڑوں سے بڑے لگتے ہیں، کسی کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں سب آگے کی سمت بھاگنا چاہتے ہیں۔ طرز حیات ایک مبہم اصطلاح بن کر رہ گیا ہے۔ Cultrual Shock نے جدید مغربی انسان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نئی دنیا ماضی سے اپنا ہر رشتہ توڑ چکی ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی سے آنے والی تبدیلیاں انسانوں کے لیے ایک آزار، مصیبت، جہنم بن گئی ہیں، ان کی مثال اس بیماری کی ہے جسے [Progeria] کہا جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۷ء میں کینیڈا میں ایک گیارہ سالہ بچہ اس بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس بیماری کے دوران اس کم عمر بچے پر جو علامات نمودار ہوئیں وہ نوے سالہ آدمی کے جسم پر رونما ہونے والی علامات سے مماثل تھیں۔ اس کی رگیں سخت ہو گئیں، سر سے بال اڑ گئے، جسم کی جلد پر جھریاں رونما ہو گئیں اور ذہنی کیفیت نوے سالہ سنکی کی سی ہو گئیں۔ گیارہ سال کی عمر میں نوے سالہ انسان کی علامات پانے والا یہ بچہ آخر کار مر گیا۔ نئی سائنس ٹیکنالوجی سے عبارت اس نئی دنیا کا نیا انسان بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے تبدیلیوں کے طوفان کے ساتھ بھاگتے ہوئے وقت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت مسلسل کم، مفلوج اور ختم ہو رہی ہے۔ وہ ایسی تیز تبدیلی کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ ثبات ایک بے معنی قدر ہے۔ یہ دور محض ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' کی مادی تفسیر ہے کسی شے کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز استعمال کرو اور پھینک دو ہر شے Disposable ہے ایک ایسا دور جہاں اشیاء کی قدر و قیمت محض وقتی ہو وہاں انسانی اقدار کیسے پنپ سکتی ہیں۔ جب ہر شے پھینکنے کے قابل ہو تو پھر ماں، باپ، اقدار و روایات رشتے ناتے تعلقات کیسے محفوظ رکھیں گے؟ یہ بھی آخر کار پھینک دیے گئے ہیں۔ ٹوفلر فیوچر شاک کی سب سے بڑی وجہ ہائی ٹیکنالوجی کو قرار دیتا ہے۔ تشدد جرائم نقل مکانی دہشت گردی کا سبب یہ ٹیکنالوجی ہے اور غامدی صاحب اس کا دفاع کر رہے ہیں۔ یہ مغرب سے زیادہ مغرب کے وفادار ہیں۔ اس تمام تجزیے کے بعد ٹوفلر اس وحشت، بربریت، بہیمیت اور ہنگامہ خیزی سے بچنے کی تجاویز بھی دیتا ہے۔ کاش غامدی صاحب اس کتاب کو پڑھ لیتے اگر وہ اجازت دیں تو اس کا ترجمہ ان کی

خدمت میں قسط وار پیش کیا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب مغرب کو اسلام سے ثابت کرنے سے پہلے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کر لیں تو نہ صرف ان کا بلکہ ان کے ذریعے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ مشل فوکالٹ کی کتابیں:

[1] Madness and Civilization. [2] The Architecture of Knowledge. [3]The birth of Clinic. [4] History of Sexuality

ایرش فرام کی کتابیں:

[1] The Heart of Man. [2] The anatomy of human Desructiveness

غامدی صاحب مغرب کے فلسفے، روشن خیالی، عہد جدید کے معجزات اور ان کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے خاص طور پر درج ذیل کتابیں پڑھیں:

[1] Culler, Jonathan, on Deconstruction: Theory and Criticism after structuralism, 1982. [2]D, James and Williams, The Great Reckoning, 1992. [3] Derrida, Jacques, of Grammatology, 1975. [4] Derrida, Jacques. Writing and Difference, 1975. [5] Derrida, Jacques. Speech and Phenomena and Other Essays on Husserl's Theory of Signs, 1979. [6]Derrida, Jacques, Dissemination, 1981. [7] Derrida, Jacques, Margins of Philosophy, 1982. [8] Derrida, Jacques. Glas, 1986. [9] Derrida, Jacques. The Post Card: From Socrates to Freud and Beyond, 1987. [10]Esposito, John L., The Islamic Threat: Myth or Reality?, 1992 [11]Fukuyama, Francis., The End of History and the Last Man, 1992. [12] Gadamer, Han-Georg, Reason in the Age of Science, 1981. [13]Gadamer, Han-Georg, Truth and Method, 1990. [14] Gellner, Ernest. Muslim Society, Cambridge, 1981. [15] Gellner, Ernest. Postmodernism, Reason and Religion, 1992. [16] Giddens, Anthony., The Consequences of modernity, 1990. [17] Giddens, Anthony., Modernity and Self-Identity: Self & Society in the Late Modern Age, 1991 [18] Lyotard, J. F. The Postmodern Condition: A Report on Knowledge, 1994. [19] Mortimer, Edward., Faith and Power: The Politics of Islam, 1982. [20] Nasr, Seyyed Hossein, Traditional Islam in

the Modern World, 1987. [21] Nasr, Seyyed Hossein., The Need for a Sacred Science, 1993. [22] Sardar, Ziauddin, Science, Technology and Development in the Muslim World, 1977. [23] Sarup, Madan, An Introduction to Post structuralism and Postmodernism, 1993.

مغرب نے انسان کو اور اس کے نفس کو علم کا ماخذ قرار دینے کے بعد ہر انسان کو نفس کا بندہ نفس کا غلام بنا دیا۔ نفسانیت کی غلامی کے نتیجے میں ہزاروں سالوں سے قائم اجتماعیتیں [Collectivities] خاندان، قبیلے، برادری، گروہ، نسل، سب تہہ تیغ ہو گئے۔ عورت اور مرد کی مساوات کے نام پر دونوں کی آزادی نے خاندان کے ادارے کا خاتمہ کر دیا۔ آزادانہ شہوت رانی مقصد زندگی بنا تو کوئی عورت لذت ترک کرنے اور دردزہ کی اذیت سہنے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا مغرب کی نسلیں مٹ رہی ہیں، گوری چمڑی والے دنیا کی کل آبادی کا صرف پانچ فیصد ہیں جو ۲۰۴۰ء تک گھٹ کر صرف ۱ء۳ فیصد رہ جائیں گے۔ لذت پرستی، نفس پرستی، Individndism، Freedom، Equality، Pleasurism، Positivism، Pregmatism کے نتیجے میں محبت، ایثار اور قربانی کی تمام روایتیں ختم ہو گئیں۔ دو دوستوں کی دوستی، ایک کمرے پر مشتمل چھوٹے سے کنبے کی بقاء، میاں بیوی پر مشتمل ایک چھوٹے سے خاندان کا استحکام۔ محبت اور ایثار و قربانی کے جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت و قربانی کے بغیر ایک بچہ پرورش کے مراحل طے نہیں کر سکتا۔ ایک کمرے کا گھر محبت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ دو دوستوں کی دوستی قائم نہیں رہ سکتی لیکن پوری مغربی تہذیب ان جذبوں کی نفی پر کھڑی کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے بنیاد تہذیب ہے جو ایثار و قربانی کے ملبے پر زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکی۔ مغرب میں ایثار و قربانی کی تہذیب قفقس کی طرح اپنی خاکستر سے جنم لے گی اور اسلام کی آغوش میں آ کر رہے گی۔ بشرطیکہ جاوید غامدی جسے جدیدیت پسند مفکرین منظر سے ہٹ جائیں۔ ایک دانشور کا بڑا عجیب نظریہ ہے لیکن حقیقت سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان دنیا بھر میں آج کل مغرب کے ہاتھوں شکست کھا رہے ہیں اور زخم اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے کہ مغرب اسلام کا دشمن ہے لیکن آثار یہ نظر آتے ہیں کہ مستقبل میں مغرب اسلام کی آغوش میں آ جائے گا اور عالم اسلام جاوید غامدی، قرضاوی جیسے دانشوروں کے ذریعے جدید بن کر مغربیت اختیار کر لے گا تب ''مسلمان مغرب'' دوبارہ عالم اسلام پر حملہ آور ہو گا تاکہ اسے ایمان و یقین کی منزل تک پہنچائے اور جدیدیت کے کفر سے آزاد کرے۔ یہ مسلمان آج مغرب سے اس کے کفر کے باعث مار کھائیں گے اور کل اپنے کفر یعنی جدیدیت کے باعث مغرب سے دوبارہ زخم سہیں گے، دانشور کا یہ تجزیہ درست نظر آتا ہے۔ عالم اسلام جس تیزی سے جدیدیت کے حصار میں جا رہا ہے۔ اس کے بعد یہی متوقع ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ عبدہٗ، سرسید، افغانی، غلام احمد پرویز، منظور احمد، جاوید غامدی اس کم زور حقیر تہذیب کو صرف اس کی سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد پر دنیا کی طاقت ور ترین تہذیب تصور کر رہے ہیں۔ معذرت خواہی کی یہ آخری حد ہے۔